جدید اردو غزل: وجودیت کے تناظر میں

عطاء الرحمٰن*

ڈاکٹر نجیب جمال**

Abstract:

Existentialism has been a popular philosophical among the French and German writers in 20th Century. Sartre, Kafke and other creative writers gave this philosophy a creative dimension. In the same century Urdu poets were influenced by this tradition. Poets like Munir Niazi, Majid Amjad, John Elia made it their creative experience in the form of Ghazal. This article reflect this strong contribution.

کثرتِ تعبیر کی وجہ سے وجودیت یا وجودی طرزِ فکر کی اصطلاح اپنے فلسفیانہ اور تکنیکی مفہوم سے بڑی حد تک بیگانہ ہو چکی ہے۔ تاہم وجودی فکر سے تعلق رکھنے والے تمام فرقے اس سے متفق ہیں کہ وجودیت وہ طرزِ فکر ہے جس میں وجود کو جوہر پر فوقیت حاصل ہے۔ وجودیت بیسویں صدی میں فروغ پانے والا وجود کا فلسفہ ہے۔ یہ ان تمام پرانے فلسفوں کا استراد کرتا ہے جس کی رو سے جوہر کو وجود پر فوقیت حاصل ہے۔ افلاطون سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک عالمِ موجودات کے برعکس اشیاء کی ماہیت اور ان کے جوہر کو ہی اصل حقیقت متصور کیا جاتا رہا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ تصوریت کے بموجب عالمِ موجودات جن ابدی اور لافانی تصورات کا فانی پرتو ہے انہیں

* سکالر شعبہ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔

** شعبہ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔

اعیان کہا جاتا ہے۔افلاطون نے اعیانِ جاوداں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر جس مابعدلطبیعیاتی نظامِ فکر کو پروان چڑھایا تھا وجودیت کا اس سے بڑا گہرا اختلاف ہے۔وجودیت کی بنیاد انسانی تجربے پر استوار ہے وجودیوں کے نزدیک ہستی کے پس پردہ کسی پراسراریت کو تلاش کرنا بے سود ہے۔اشیاء ویسی ہی ہیں جیسی کہ دکھائی دیتی ہیں۔صدیوں سے ادب اور فلسفے کو جس مابعدالطبیعیاتی نظامِ فکر چراغ روشن کیے ہوئے تھا وجودی طرزِ احساس کے فروغ سے بجھ کر رہ گیا۔وجودیت نے ہر طرح کی تجریدیت سے کنارہ کشی اختیار کرکے ہسرل (Husserl) کی مظہریات کی طرف پیش رفت کی۔(۱)

وجودیت کے پس منظر کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی میں ڈنمارک کے فلسفی کرکیگارد کے افکار میں اس تحریک کے عناصر اول اول ظہور پذیر ہوئے، جو بعد میں جرمنی اور بالخصوص فرانس کے فلسفیوں کے نگارشات میں ایک نمایاں فلسفیانہ نظام کی صورت میں ابھرے۔مارسل، سارتر، کامیو اور دیگر فلسفیوں نے وجودیت کے مابہ الامتیاز کو فلسفیانہ اور ادبی سطح پر پیش کرکے اس کے خدوخال کو اجاگر کیا وجودیت کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے سی۔اے قادر رقمطراز ہیں کہ:

> ''وجودیت کا ظہور تاریخ کے اس دور میں ہوتا ہے جب ہر طرف سے فرد کی فردیت پر حملے ہو رہے تھے۔انسان کو معروض (Object) بنا دیا گیا تھا اور جبریت کا دور دورہ تھا۔مادیت اور مطلق تصوریت نے انسان کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور اسے مقہور و مجبور زندگی دے رکھی تھی۔''(۲)

وجودیت چونکہ ایسے دور کی پیداوار تھی جس میں سیاسی وسماجی اور معاشرتی اختلال نے اخلاقی اقدار کو درہم برہم کر دیا تھا اور عدم تحفظ کا شدید احساس لوگوں کے باطن میں سرایت کر چکا تھا۔مادیت پرستی اور سائنسی ترقی نے فرد کو بے چہرگی کے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔پہلی جنگِ عظیم میں موت کی ارزانی نے کائنات اور انسانی زندگی سے معنی چھین لیے تھے۔فرد کی زندگی ذہنی و جذباتی بحران کا شکار تھی۔مذہب کو زندگی سے منہا کرنے کے بعد اہل یورپ میں تنہائی اور مغائرت کا جو احساس پیدا ہوا اس نے وجودیت کے فروغ کی راہ ہموار کر دی۔یہ بھی کہا گیا کہ وجودیت فی الاصل ہیگل کی تاریخی جدلیات یا معروضی عینیت اور نفسیاتی جبریت کے ردِعمل کے طور پر منظرِ عام پر آئی۔(۳) ناصر عباس نیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

> ''وجودیت فلسفہ ہے، مگر ساتھ ہی فلسفہ طرازی، نظریاتی موشگافیوں اور مابعدالطبیعیاتی نکتہ آفرینیوں کو مسترد کرتا ہے۔گویا یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو فلسفے کی پوری روایت کو منہدم کرتا ہے۔اس لیے نہیں کہ وہ فلسفے کی سمت کو بدلنا یا فلسفے کی نئی بنیاد رکھنا چاہتا ہے

کیونکہ اس بات کا مطلب فلسفیانہ مسائل کو ہی از سرِ نو مرتب کرنا ہے جب کہ وجودیت ان تمام تصوراتی اور نظری مباحث سے خود کو آزاد رکھنے کی کوشش کرتی ہے جو انسان کو وجود (Being) سے منقطع یا ماورا کرتے ہیں۔''(۴)

وجودیت کو انتشار کا فلسفہ (Philosophy of Crisis) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ بحران میں انسان پر اس کی وجودی پرتیں کھلتی ہیں۔ زندگی سے مذہب کو منہا کرنے کے بعد انسانی وجود کے مسائل کو حل کرنے میں وجودیت کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اس کا تجربہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید عشرت رقم طراز ہیں کہ:

''وجودیت نے کسی حد تک انسان کے اس اندرونی خلا کو محسوس کیا، انسان کے اندر کا کھوج لگانے کی کوشش کی تاہم وہ بھی محض انسان کو اس کے اندر کے خلا کا سراغ دینے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔''(۵)

وجودی چونکہ معروضیت کے برعکس موضوعیت پر اپنے فلسفے کی بنیاد استوار کرتے ہیں اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

''وجودیت کی جڑیں اس رومانیت میں پائی جاتی ہیں جو فرد کی اہمیت اور انفرادی آزادی کے نام پر اٹھارویں صدی کی روشن خیالی اور عقلیت کے خلاف ایک بھرپور اور پر اثر احتجاج تھی۔''(۶)

مابعد الطبیعیات سے اجتناب، عقل کی مطلقیت سے انکار اور انسانی تجربے کی قطعیت کو اصل حقیقت قرار دے کر ہی ہم وجودیت کی اقلیم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وجودیت کا ایک بہت اہم عنصر آزادی ہے۔ چونکہ انسان پر اپنے وجود کا مکمل انکشاف بحران میں ہی ہوتا ہے اس لیے اس وقت اسے آزادانہ فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو کہ عقل کے بجائے اس کے پورے وجودی تجربے کا حاصل ہوتا ہے۔ آزادی اور انتخاب کے جوہر سے اس کائنات میں ہمیں صرف اور صرف انسانی وجود ہی مالا مال دکھائی دیتا ہے۔ سارتر کے وجودی افکار میں آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سارتر نے استعماری قوتوں کے خلاف مقاومت کو اپنی تحریروں میں اکثر سراہا ہے۔ فرانس پر جرمنوں کے غاصبانہ قبضے کا ذکر کرتے ہوئے سارتر نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ:

''ہم کبھی اتنے آزاد نہ تھے جس قدر کہ جرمنوں کے زمانۂ اقتدار میں تھے۔ جب کہ ہم تمام حقوق سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ ہمیں بات تک کرنے کا حق نہ تھا۔۔۔ ہماری مزاحمت نے ہمیں آزادی کے حقیقی تصور سے آشنا کیا۔''(۷)

گویا آزادی انسانی وجود کا جزوِ لاینفک ہے۔ سارتر جس مطلق آزادی کا تصور پیش کرتا ہے وہ کسی بھی معاشرتی سیاق و سباق میں ممکن نہیں ہے۔ سارتر کا تصورِ آزادی دہریت پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک خدا کے وجود کو

تسلیم کر لینے سے انسان کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ آزاد رہنا انسان کی مجبوری ہے۔ تصورِ آزادی کے ساتھ ہی ذمے داری کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ انسان ان تمام اعمال و افعال کا ذمے دار ہے جن کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔ سارتر کے نزدیک انسان آزادی کے کرب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اقدار کے ہیولے بناتا ہے اور ریشم کے کیڑے کی طرح اقدار کے خول میں پناہ لینا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی محض خام خیالی ہے۔ انسان کو بغیر کسی خارجی سہارے کے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے۔

ایک وجودی کا کام خود کو حقیقت مطلقہ کی تجریدیت میں مدغم کرنا نہیں اور وجود کو التباس اور عارضی سمجھنے کے بجائے اپنی توجہ کو اپنے وجود پر مرکوز کرنا ہے۔ کوئی وجودی جتنی شدت سے اپنے وجود کا اثبات کرے گا، اتنی شدت سے اس پر تنہائی کا احساس مسلط ہو گا۔ کرکیگارڈ کے خیال میں کوئی فرد معاشرتی علائق و روابط سے ہٹ کر اپنے وجود پر غور کرے گا تو لازمی طور پر وہ تنہائی (Loneliness) اور مغائرت (Alienation) کا شکار ہو گا۔ اور وہ اس طرزِ حیات کو جو خود کو اپنے وجودِ معنوی پر غور و فکر کرنے کے بجائے دوسروں کے اختراع کردہ راستے پر لے کر چلے گو اصطلاح میں وجودِ غیر مصدقہ (Inauthentic Existence) قرار دیتا ہے۔ (۸)

تنہائی اور مغائرت کا احساس فرد کو اپنے وجود پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اس پر جب یہ منکشف ہوتا ہے کہ موت زندگی کا وہ معکوس روپ ہے جو وجود کے تمام راستوں کو مسدود کر دے گی تو ہمارے اندر دہشت جنم لیتی ہے۔ موت کو ایک ناقابلِ انکار حقیقت تسلیم کرنے کے بعد دہشت سے ہم نجات حاصل کر لیتے ہیں اور وجودِ معنوی کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے اپنے شعوری فیصلوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یوں ہم غیر مصدقہ زندگی کے حصار سے نکل کر مصدقہ (Authentic) زندگی گزارنے کی طرف پیش رفت کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دہشت اس وقت اثباتی روپ میں ڈھل جاتی ہے جب فرد پر اپنی آزادی کا انکشاف ہوتا ہے۔

سارتر اور کرکیگارڈ کا تصورِ آزاری اگرچہ اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ فرد کسی نظام کا تابع مہمل نہیں اور وہ کسی بحران کے خلاف سینہ سپر ہو کر اپنا آزادانہ فیصلہ کرتا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں کہ:

> ''ہر آزادی زمان و مکاں کے دائرے میں مقید ہے اس لیے اس کی آزادی محدود ہے،
> کوئی اہم فیصلہ کرنے کے لیے وقت بہت محدود ہوتا ہے اس لیے آزادیِ انتخاب
> ہمارے ذہنی اضطراب کا سبب بن جاتی ہے۔'' (۹)

ڈاکٹر شاہین مفتی صاحبہ نے وجودیت کے اساسی تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے لغویت اور لاتعلقی کے بحران کو وجودیت کی اصل قرار دیا ہے۔ (۱۰)

لغویت ایسی وجودی صورتِ حال کی عکاس ہے جس کی رو سے دنیا کی ہر چیز نا قابلِ اعتبار اور غیر یقینی ہے۔ کامیو نے اپنی ایک کتاب ''دی متھ آف سسی فس'' میں جس میں انسانی وجود کو یونانی دیو مالا کے ایک کردار سسی فس کی مانند قرار دیا ہے جس کو دیوتاؤں کی طرف سے یہ سزا ملی تھی کہ وہ ایک چٹان کو پہاڑ کے اوپر پہنچائے جونہی وہ پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچتا ہے تو وہ چٹان لڑھک کر نیچے کھائیوں میں جا گرتی ہے۔ ڈاکٹر سلطان علی شیدا کے بقول:

> ''اس واقعے میں کامو کے لیے جو چیز اہم ہے وہ سسی فس کا عزم اور وہ ہمت جو اسے اپنے بے کار اور بے مقصد کام میں تن دہی سے مشغول رکھتا ہے۔ انسان کے لیے کامو انہی خصوصیات کو اہم سمجھتا ہے جو اسے اپنے لغو و مہمل حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بخشتی ہیں۔ اس طرح مہملیت کا شعور و آگہی انسان کی اس مہملیت پر فتح کے مترادف ہے۔''(۱۱)

پاکستان میں وجودی افکار کے فروغ پذیر ہونے کا اگر تجزیہ کریں تو سب سے پہلے ہم یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ:

> ''پاکستان بحرانوں کا ملک ہے سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی بحران پہلے دن سے اسے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اور ستم یہ ہے کہ آج تک ان بحرانوں سے عہدہ برا ہونے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی۔ اب چونکہ وجودیت خود بھی بحران کا فلسفہ ہے اس لیے یہاں اس کے لیے سازگار ماحول موجود ہے۔''(۱۲)

اس کے علاوہ فیشن کے طور پر بھی ہمارے کئی ادیبوں نے اس فلسفے کو اپنایا ہے سارتر نے اپنی کچھ تحریروں میں تیسری دنیا کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے اور استعماری قوتوں کے خلاف قلم اٹھایا ہے اس وجہ سے بھی یہاں کے ادیبوں کے لیے وجودی افکار ایک گونہ کشش کا باعث ہیں۔

اردو غزل نے حقیقت کا جو تصور فارسی غزل سے اخذ کیا تھا وہ مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا تھا۔ مابعد الطبیعیاتی اقدار نے وحدت کے جس تصور کو پیش کیا تھا وہ ہمارے ادب کی جان تھا۔ مظاہر فطرت کی کثرت کے پیچھے، وحدت کی تلاش وہ عمل تھا جس نے معاشرے کو ایک اکائی میں پرو رکھا تھا۔ غزل تجسیم کے بجائے تجرید اور ماورائیت کی حامل تھی۔ غزل کا محبوب مادی وجود کا حامل نہیں تھا یا دوسرے لفظوں میں غزل کا تصورِ محبوب، تصورِ الہ سے مربوط تھا۔ حیات بعد ممات کا تصور بھی اسی مابعد الطبیعیاتی فکر سے منسلک تھا۔ بیسویں صدی میں برق رفتاری سے سائنسی اور عقلی تصورات کے پھیلاؤ نے اس تصورِ حقیقت کو بڑی حد تک بدل کے رکھ دیا۔ غزل نے تجسیم سے تجرید کی طرف پیش رفت کی۔ مابعد الطبیعیاتی اقدار تشکیک کی زد میں آ گئیں اور وجودی افکار، ادب میں فروغ پانے لگے۔ ذیل میں نمائندہ پاکستانی غزل گو شعراء کے کلام میں وجودی افکار کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

زمان ومکاں کی بے کنار وسعتوں کے مقابل انسانی وجود کی بے حیثیتی نے مجید امجد کا لمحۂ موجود اور مظاہر سے اٹوٹ رشتہ قائم کر دیا ہے۔ اپنے وجود کی معنویت کی تلاش نے انہیں جس اضطراب سے دوچار کر دیا تھا وہی ان کی یاسیت کا باعث ہے۔ انسانی وجود کی فنا پذیری سے جنم لینے والی دہشت نے بیگانگی اور مغائرت کو ان کے وجود کا حصہ بنا دیا ہے۔ یہی مغائرت ان کی تنہائی کا باعث ہے۔ سعادت سعید کی رائے میں

''مجید امجد کی شاعری میں معاصر عہد کی حقیقی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر موجود دکھوں، غموں، مصیبتوں اور بحرانوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنا دیا ہے۔''(۱۳)

اک لہر اٹھی اور ڈوب گئے ہونٹوں کے کنول آنکھوں کے دیے
اک گونجتی آندھی وقت کی بازی جیت گئی رت بیت گئی

مرے نشانِ قدم، دشتِ غم پہ ثبت رہے
ابد کی لوح پہ تقدیر کا لکھا نہ رہا

تیری آہٹ قدم قدم اور میں
اس معیت میں بھی رہا تنہا

منیر نیازی کی شاعری ہوشیار پور سے مہاجرت کے جس تجربے سے جڑی ہوئی ہے اس نے منیر نیازی کے وجودی تجربات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئے دیار کا سفر نئے واہموں، نئے وسوسوں اور نئے دہشتوں کے امکانی تجربات کی صورت میں شاعر کے لاشعور کا حصہ بنا ہوا ہے۔ نامعلوم کی کشش کا حیرت انگیز تجربہ شاعر کے جن فکری امکانات کی وسعت کا آئینہ دار ہے اس کی چند جھلکیاں دیکھیے:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

کل دیکھا اک آدمی اٹا سفر کی دھول میں
گم تھا اپنے آپ میں جیسے خوشبو پھول میں

رہتا ہے اک ہراس سا قدموں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے دشت، دشت نوردوں کے ساتھ ساتھ

صبح سفر کی رات تھی تارے تھے اور ہوا
سایہ سا ایک دیر تلک بام پر رہا

موخر الذکر شعر میں ''سایہ'' شاعر کی ذات کے ہی التباسی روپ کا مظہر ہے۔ سعادت سعید منیر نیازی کے مابہ الامتیاز کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''منیر نیازی کی ابتدائی غزلیں عہد جدید میں دہشت، خوف اور بربریت کے احساسات کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔ تشدد، دہشت، قتل و غارت گری، اجاڑ پن کے تصورات و تلازمات سے ان کی ابتدائی غزلیہ شاعری بھری پڑی ہے۔ غیر عقلیت اور لامعنویت کے جدید تصورات بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔'' (۱۴)

منیر نیازی کی شاعری میں عصری صورتِ حال کی حسیاتی آگہی سے پھوٹنے والی دہشت کے نقوش جابجا بکھرے ملتے ہیں۔ لایعنیت کے کرب نے ان کی شاعری میں جو معنی پیدا کیے ہیں وہ عہد جدید کے انسان کے باطن کو سمجھنے میں ہماری معاونت کرتے ہیں۔ آرزو اور شکست آرزو نے انہیں حقیقت کے تضادات سے شناسائی فراہم کی ہے۔ عدم تحفظیت کے احساس نے ان کے لاشعور میں پنپنے والے ازلی ابدی خوف کو جوار بھاٹے میں تبدیل کر کے شعور میں دھکیل دیا ہے جو تخلیقی عمل کے مراحل سے گزر کر ان ہوش ربا مناظر اور کیفیات کا عکاس بن گیا ہے جس نے کم و بیش ہر ذی شعور کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ نظیر صدیقی منیر نیازی کے ہاں وجودی عناصر کو نشان زد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''انسانی زندگی کی لایعنیت (Absurdity) اور اکتاہٹ (Boredon) عہد حاضر کے وجودی (Ext) احساسات میں سے ہے۔ منیر نیازی کے بعض شعروں میں ان احساسات کا عکس ملتا ہے۔'' (۱۵)

معنی نہیں منیر کسی کام میں یہاں
طاعت کریں تو کیا ہے بغاوت کریں تو کیا

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

رشتہ روایتوں سے بھی باقی نہیں رہا
آئندہ کے سفر کے افق پر بھی کچھ نہیں

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک وخون کی دہشت سے بھر گئیں

احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی کی انفرادیت کو اس کے غیر مطمئن وجودی تجربے سے مربوط قرار دے کر لکھتے ہیں کہ:

''اگر منیر نیازی اپنے عصر کے شعراء سے کچھ الگ ہٹ کر آگے بڑھ رہا ہے تو اس کی وجہ اس کی تیز دھار انفرادیت ہے جو پھیل کر انانیت تک پہنچتی ہے، مگر منیر کی انا ایک بیراگی کی انا نہیں وہ خاص واردات، خاص تجربات کی انا ہے، چنانچہ اس انا کے اجمال میں لاکھوں باشعور، حساس اور صورتِ حال سے غیر مطمئن افراد کی تفصیل پوشیدہ ہے۔''(۱۶)

انیس ناگی نے منیر کی غزل میں اس خود آگہی کا سراغ لگایا ہے کہ جو فراق کی دائمی کیفیت اور خود اذیتی سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ فراق کی یہ کیفیت جہاں انفرادی ہے وہیں اجتماعی بھی ہے۔ انیس ناگی کے بقول:

''منیر نیازی ان چند شعراء میں سے ہے جو حاضر کے تہذیبی پروسس (Process) کو زوال کے رنگ میں دیکھتا ہے۔ یہ صرف اس کی داخلی نفسیاتی کیفیات کا مظہر نہیں بلکہ اسے خارجی صورتِ حال سے متعلق کر کے منیر نیازی ہماری نفسیاتی اور جذباتی روئیداد کا عجیب وغریب (Complex) تیار کرتا ہے جو طلسماتی اور آسیبی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی اور اصلی بھی ہے۔''(۱۷)

اگر دیکھا جائے تو منیر نیازی کے ہاں بے معنویت، لاحاصلی، بیگانگیت کے فروغ پذیر ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ نئی سماجی صورتِ حال نے ان کے اندر وہ احساسِ مغائرت پیدا کر دیا ہے جس کے حصار سے باہر نکلنا کسی آدرشی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ منیر نیازی کو اس تاریخی جبر، خوفِ مرگ، مایوسی اور اضطراب سے ان تیقن آمیز لمحوں میں نجات مل جاتی ہے جب باطن کو مستنیز کرنے والی روشنی، مذہبی اقدار کی صورت میں ان کے وجود پر اترتی ہے یوں منیر نیازی نے اکثر وجودیوں کے برعکس انسانی وجود اور کائنات کی لایعنیت کو معنی سے ہم کنار کر لیا ہے۔

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو
بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمد میں منیر
اور سوچیں پھر وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

منیر نیازی نے غزل کو تعقل کے حصار سے نکال کر احساسات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے شعروں سے منطقی معانی نکالنے کی شعوری کوشش ہمیں اس کے شعری تجربے کی اقلیم میں داخل نہیں ہونے دیتی۔منیر نیازی کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہے۔منیر نیازی نے لفظوں کے ذریعے جو طلسمی تمثال خانہ تعمیر کیا ہے وہ اگر ایک طرف ان کے رومانی تجربات پر دال ہے تو دوسری طرف خوف، حیرت، دہشت کے ان تجربات سے بھی ہمیں متعارف کرواتا ہے جو اس عہد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کی بدولت ان کے وجود کا حصہ بنے ہیں۔

ناصر کاظمی جب سرسوں کے پھول کو اپنا ہم عصر قرار دیتے ہیں تو وہ یقیناً اس مشینی کلچر اور صنعتی تمدن سے دوری کا اظہار کر رہے ہیں جس میں فرد اجتماع کا حصہ بن کر اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے۔ ناصر کی فطرت کی طرف پیش رفت دراصل ان کے اپنے وجود کے اثبات کی ہی ایک صورت ہے۔ناصر کے نزدیک فطرت ہی وہ مظہر ہے جو تاریخی جبر، بے بسی اور وجود کی لایعنیت کو معنی فراہم کر سکتا ہے۔

ہجرت اگرچہ ایک اجتماعی تجربہ تھا لیکن اس نے ہر فرد کو انفرادی طور پر جس محرومی، افسردگی اور گم گشتگی سے دوچار کیا تھا اس نے فرد کو ازسرِ نو اپنے وجود کی معنویت پر غور وفکر کرنے پر اکسایا۔ایک مانوس مقام سے غیر مانوس مقام کی طرف سفر، فرد کو جس داخلی اضطراب سے آشنا کرتا ہے اس کا اظہار ناصر کی غزل میں کہیں راست اور کہیں رمزی پیرائے میں ہوا ہے۔ حامدی کاشمیری ناصر کی غزل کی علامتی کائنات کے حوالے سے اس عہد کی معروضی صورتِ حال اور فرد کے داخلی بحران کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ناصر کاظمی:

> ”قدرتی پن اور بے تکلفی سے اظہار کے علامتی انداز کی جانب رجوع کرتے ہیں، کلیدی علامتوں میں رات کو لیجیے یہ تخلیقیت، اسراریت، اجنبیت، ویرانی، اداسی، لا تعلقی اور غیر الوطنی کے احساسات کا گنجینہ بن جاتی ہے۔۔۔اسی طرح شہر انسانی قدروں کی پامالی کی علامت بن کے ابھرتا ہے۔“(۱۸)

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

جون ایلیا کا کلام اکتاہٹ، بے خوابی، اذیت پسندی، تشکیک، لغویت، بیگانگی اور کراہت جیسی ملی جلی وجودی

کیفیات کا حامل ہے۔ جون ایلیا کی وجودی الجھن کا سلسلہ ان کی جذباتی و جنسی زندگی سے جا ملتا ہے۔ ان کی دروں بینی نے جہاں ان کے اندر کائناتی مسائل پر غور و فکر کے عمل کو مہمیز کیا وہیں اس جنسی اضطراب سے بھی دوچار کیا ہے جس نے انہیں لاتعلقی کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ فکری سطح پر ایسے خلا میں مقید دکھائی دیتے ہیں جہاں ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش سے انہیں نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وجودی تحلیلِ نفسی کے ذریعے ان کی اذیت پسندی کے محرکات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کے چند اشعار دیکھیے جو ان کی وجودی الجھنوں کے آئینہ دار ہیں:

ہر آن اک جدائی ہے خود اپنے آپ سے
ہر آن کا ہے زخم جو ہر آن کھائیے
بند باہر سے مری ذات کا در ہے مجھ میں
میں نہیں خود میں، یہ اک عام خبر ہے مجھ میں
بہت ہی خوش ہے دل اپنے کیے پر
زمانے بھر میں خواری ہوگئی ہے
میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں
حاصلِ کن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں
یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

شکیب جلالی نے جس نئی جذباتی کیفیت کو لفظوں کا لبادہ اوڑھایا ہے وہ اس کے ایسے وجودی اضطراب کی زائیدہ ہے جس کے ڈانڈے جبلتِ مرگ سے جا ملتے ہیں۔ شہزاد احمد کی غزل میں جس محبوب کا تصور ابھرا ہے وہ ارضی بو باس کا حامل ہے، شہزاد نے باطن کی گہرائیوں میں اتر کر ماورا تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ان کے ہاں انسانی وجود کو سمجھنے کی خواہش، مابعد الطبیعیاتی حقائق کو سمجھنے کی خواہش بن جاتی ہے اور یہی خواہش ان کے وجودی اضطراب کا باعث ہے۔ ۱۹۶۰ء میں نئی شاعری کی تحریک نے جس لسانی تشکیلات کی بنیاد رکھی تھی، اس کے زیر اثر ظفر اقبال کی تجریدیت اور لایعنیت کی حامل غزل منظر عام پر آئی۔ غزل سے مابعد الطبیعیاتی تناظر منہا کر کے اسے عام انسانی صورتِ حال سے ہم رشتہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ ترقی پسند رجحانات رکھنے والے شاعروں کی غزل

میں جو مزاحمتی ادب منظر عام پر آیا وہ بھی ایک حد تک وجودی طرزِ فکر کا ہی زائیدہ ہے کیونکہ مزاحمتی ادب کا رشتہ شخصی آزادی سے جاملتا ہے۔ ترقی پسندوں نے ''میں'' کی جگہ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کر کے کمزور اناؤں کو ایک یونٹ میں ڈھال کر اجتماعی وجودی رویے کو پروان چڑھایا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسانی تقدیر کسی غیر مرئی طاقت کی دست نگر نہیں ہے بلکہ انسان بحران کی حالت میں اپنے زور بازو پر اعتماد کرنا سیکھتا ہے۔ مجمع میں فرد کا خود کو تنہا محسوس کرنا، عین وصل میں ہجر کے احساس کی بیداری وہ وجودی مسائل ہیں جو مختلف انداز میں نئی غزل میں منعکس ہوئے ہیں:

آگ ہے اور سلگ رہی ہے حیات
راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں میں (انور شعور)

خود اپنی دید سے اندھی ہیں آنکھیں
خود اپنی گونج سے بہرا ہوا ہوں (سلیم احمد)

اتار پھینکتا میں بھی یہ تار تار بدن
اسیرِ خاک ہوں کرنا پڑا گزارا مجھے (ظفر اقبال)

بند کر لیتا ہوں جب اس کے سبھی دروازے
کچھ ہوا دار سا مجھ کو مرا گھر لگتا ہے (الف رسول)

کسی صورت بھی دل لگتا نہیں؟ ہاں
تو کچھ دن سے یہ حالت ہے؟ نہیں تو (جون ایلیا)

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جدید اردو غزل کے خدوخال بنانے میں وجودی طرزِ فکر کا نمایاں کردار ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے وجودیت کو یوں غزل کو جزو بنایا ہے کہ کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، ''منتخب ادبی اصطلاحات''، شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۹

۲۔ سی۔اے۔قادر، پروفیسر، ڈاکٹر، ''فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۸

۳۔ سلیم آغا، قزلباش، ڈاکٹر، ''جدید اردو افسانے کے رجحانات''، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی، ص ۴۰۴

۴۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، ''جدید اور مابعد جدید تنقید''، انجمن ترقیِ اردو، کراچی، ص ۳۷۶

۵۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، ''ژاں پال سارتر'' مشمولہ ادب فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ شیما مجید، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۵۵۵

۶۔ سلطان علی شیدا، ڈاکٹر، ''وجودیت پر ایک تنقیدی نظر''، مشمولہ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ ندیم احمد ڈاکٹر، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴۸

۷۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، ''ژاں پال سارتر'' مشمولہ، ادب فلسفہ اور وجودیت، ص ۵۵۲

۸۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، ''غالب اور فلسفۂ وجودیت'' ماہِ نو، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۴۶

۹۔ غلام جیلانی اصغر، ''وجودیت کیا ہے''، ادبی دنیا، ۱۹۶۴ء، ص ۲۵۰

۱۰۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ''جدید اردو نظم میں وجودیت''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۴۰۔۴۱

۱۱۔ ڈاکٹر سلطان علی شیدا، ''وجودیت پر ایک تنقیدی نظر''، مشمولہ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۳۶۴

۱۲۔ قاضی جاوید، ''پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹۷۔۹۸

۱۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ''پاکستانی اردو غزل''، مشمولہ، اردو غزل، مرتبہ، کامل قریشی، پروگریسو بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔۲۹۸

۱۵۔ نظیر صدیقی، ''جدید اردو غزل: ایک مطالعہ''، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۹

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''دیباچہ: چھ رنگین دروازے''

۱۷۔ انیس ناگی، ''تعارف منیر نیازی، مشمولہ آٹھ غزل گو شاعر''، مرتبہ جاوید شاہین، ص ۱۴۔۱۵

۱۸۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر، ''جدید شعری منظر نامہ''، سری نگر، ۱۹۹۰ء، ص ۶۸